سوال نمبر ۱ نظیر اکبرآبادی سے اپنی واقفیت کا اظہار کیجئے!

جواب: نظیر اکبرآبادی تقریباً ۱۷۳۵ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے بہت طویل عمر پائی اور بہت سن رسیدہ ہو کر ۱۸۳۰ء میں انتقال کیا۔ مقام ولادت عام طور سے دلی سمجھا جاتا ہے مگر بعض لوگوں نے پٹنہ بھی بتایا ہے۔ بہرحال ایام طفولیت دلی میں گذرے۔ احمد شاہ ابدالی کے حملہ کے وقت دہلی چھوڑ کر آگرہ چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ زیادہ تر محلہ تاج گنج میں رہے اور وہیں پیوند خاک ہوئے۔ ذریعہ معاش عام طور پر معلمی کا مشغلہ رہا۔ لالہ بلاس رام کے یہاں ان کے لڑکے کو پڑھانے کی خدمت پر عرصہ تک ملازم رہے اور محض قلیل تنخواہ پر ساری زندگی گذار دی۔

ان کی علمی قابلیت کے متعلق اختلاف ہے۔ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ معمولی پڑھے لکھے تھے۔ مگر یہ غلط ہے۔ ان کے سارے کلام پر بغور نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فارسی کی اچھی استعداد رکھتے تھے اور عربی سے بھی کسی قدر آشنا تھے۔ اس کے علاوہ برج بھاشا، پنجابی اور پوربی وغیرہ مقامی زبانوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ نہایت نیک طبیعت حلیم اور منکسر المزاج انسان تھے۔ ان کا مشرب صلح کل تھا۔ مذہبی تعصب سے بالکل بیگانہ تھے۔ اسی لئے ہندو مسلمانوں میں یکساں طور پر عزیز و محبوب تھے۔ تیراکی، ورزش اور سیر سپاٹے سے خاص ذوق رکھتے تھے۔ جوانی کے دنوں میں ان کے اشغال جوانانہ رہے اور بڑھاپے میں صوفی بن گئے۔ وہ نہایت قانع، شگفتہ مزاج اور دلچسپ انسان تھے زندگی کے مصائب کی کبھی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ ہمیشہ خود بھی ہنستے رہتے تھے اور دوسروں کو بھی ہنساتے رہتے تھے۔

نظیر بہت زود گو اور پرگو شاعر تھے جس واقعہ سے متاثر ہوتے تھے اسے فوراً بے ساختہ نظم کی صورت میں ڈھال لیا کرتے تھے۔ اگر ان کا سب کلام جمع ہوتا تو بہت بڑا دفتر ہو جاتا چونکہ اپنے کلام کو محفوظ رکھنے کی طرف توجہ نہیں کی اس لئے زیادہ تر حصہ ضائع ہو گیا جو بچ رہا وہ شائع ہو گیا وہ بھی اردو ادب کے لئے سرمایہ افتخار ہے۔

نظیر فطری شاعر تھے۔ انہوں نے فن شاعری کسی سے نہیں سیکھا اپنی شاعرانہ طبیعت سے مجبور ہو کر شاعری کرنے لگے۔ نظیر اردو زبان میں نظم گوئی کے موجد کہے جاتے ہیں۔ افسوس تعلیم یافتہ طبقہ میں ان کی شاعری کی قدر نہیں ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ لوگوں نے ان کے کمال کو پہچانا۔ ان کی زبان عامیانہ اور انداز بیان نہایت سادہ ہے، صاف ہے۔ اپنی نظموں کے لئے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جو عوام کی زندگی اور ان کی دلچسپی کا باعث ہیں۔ ان کا کلام نہایت شوخ رنگین، دلکش اور موثر ہے ان کے کلام میں ظرافت کا رنگ بھی نہایت شوخ اور پر لطف ہے اور اکثر نظموں میں ایک قدرتی حسن کی طرح جھلکتا ہے۔ نظیر حقیقی ہندوستانی شاعر ہیں۔ ان کے کلام میں مقامی رنگ نہایت واضح اور روشن ہے۔ چاہے وہ موسموں کا بیان ہو چاہے تہواروں کا پھلوں کا تذکرہ ہو یا مقامات کا تجربہ نعمت کی بابت ہوں یا اخلاق و تصوف کا ہر جگہ ہندوستانی ہے۔ ان میں خالص دیسی الفاظ کی بہتات ہے۔ ہندی اور بھاشا کے الفاظ بھی خوبصورتی کے ساتھ ادا کئے گئے ہیں۔ نظیر نے مناظر فطرت کو بھی خوب بیان کیا ہے۔ موسمی کیفیتوں کے ساتھ انسانی دلچسپیوں کا جو تعلق ہے اور اردو کو ہوا ہے کہ اخلاق و تصوف پر جو نظمیں نظیر نے لکھی ہیں وہ نہ صرف ان کے خلوص اور نیکی کو ظاہر کرتی ہیں بلکہ پڑھنے والوں کے دلوں میں ان کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہیں۔

ان کے کلام میں جہاں محاسن ہیں وہیں بعض معائب بھی ہیں۔ سب سے نمایاں عیب ان کی فحش پسندی اور ابتذال ہے جن نظموں میں عموماً فحش گوئی کا موقع نہیں ہوتا ہے وہاں بھی بے خطر کر کے کوئی پہلو پیدا کر ہی لیتے ہیں۔ جہاں اس کا موقع ہے وہاں کی نہ تو پوچھیے۔ ان کے جنسی جذبات میں عموماً پستی اور بازاری پن ہے۔ یہ غالباً پست طبقے کے ساتھ ہم نشینی کا اثر ہے۔ ان کا ایک دوسرا عیب الفاظ کی تکرار اور نامانوس الفاظ کی بھر مار ہے۔ ان کی واقفیت ان محدود حلقوں سے باہر بہت کم ہے۔ نظیر کا ایک اور عیب قواعد زبان سے بے احتیاطی ہے اور اصول و عروض سے بے نیازی ہے۔ اردو کے جس دور سے نظیر گزر رہے تھے اس میں اردو شاعری پختہ ہو کر کافی صاف ہو چکی تھی۔ اس لیے اس عہد میں ایسی بے احتیاطیاں قابل اعتراض ہیں۔

x

سوال نمبر ۲۔ نظیر اکبر آبادی بحیثیت شاعر تنقیدی تبصرہ کیجیے؟

جواب: بحیثیت شاعر نظیر اکبر آبادی کا اصلی مقام ابھی تک متعین نہیں ہوا ہے اور ان کے کلام کا صحیح جائزہ ابھی تک نہیں لیا جا سکا ہے۔ بلکہ یہ بھی ابھی تک طے نہیں ہو سکا ہے کہ وہ کون کون سی زبانوں کے شاعر تھے۔ عام طور سے نظیر کی شہرت اردو زبان کے شاعر کی حیثیت سے ہے اور مجموعی طور پر یہ صحیح بھی ہے لیکن یہ خیال درست نہیں ہے کہ وہ بہت کم پڑھے لکھے تھے ان کی کلیات میں بہت سی فارسی کی غزلیں اور لمبی لمبی نظمیں ہیں اور نہایت بے تکلف ہیں۔ بعض جگہ انہوں نے عربی کے اشعار پر مصرعے بھی تضمین کیے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عربی سے بھی بے بہرہ نہیں تھے۔ بھاشا اور ہندی تو اس خوبی اور کثرت سے لکھی ہے کہ ان زبانوں میں مہارت کے متعلق شبہ کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

نظیر کے دور میں ایک نئی زبان ہندوستان میں پیدا ہو کر پرورش پا رہی تھی اور کافی ترقی کر چکی تھی۔ یہ فارسی کے مقابلہ میں ہندی کہلاتی تھی اور اس میں نظم و نثر لکھی جانے لگی تھی۔ اس دور کے پڑھے لکھے لوگ اس زبان سے آشنا ہو چکے تھے اور اکثر اس میں طبع آزمائی بھی کیا کرتے تھے اس کو بعد میں لوگ ریختہ اور اردو کہنے لگے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو بعض مقامی بولیوں میں یعنی بھاشا وغیرہ میں مہارت اور مشق پیدا کر کے ان زبانوں میں بھی شاعری کرتے تھے۔

"ہندی" کا لفظ اتنے مختلف معنوں میں مستعمل ہے کہ اس کے اندر خاصا ابہام پیدا ہو گیا ہے۔ یہ لفظ عربی ہے۔ بانیٔ اسلام نے اسی لفظ سے اس ملک کو جو عرب سے دکھن کی جانب ہے ہند کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ عربی میں اس ملک والوں کو یا اس کی چیزوں کو ہندی کہتے ہیں۔ جب فارسی بولنے والے ترک یا مغل وغیرہ اس ملک میں آئے تو وہ اس کے باشندوں کو ہندو اور اس ملک کو ہندوستان کہنے لگے۔ ان کے آنے سے اس ملک کی دفتری زبان فارسی ہو گئی اور مدتوں رہی۔ اس وقت اس ملک کے مختلف مقامات میں مختلف مقامی بولیاں یا بھاشائیں مروج تھیں۔ ان فارسی بولنے والے فاتحین اور بھاشا بولنے والے مفتوحین میں جب اختلاط بڑھا تو ایک نئی زبان ایرانی، فارسی اور ہندوستانی زبانوں کا مخلوط ہو کر عالم وجود میں آئی۔ اس زبان کی ایجاد و ترقی میں ہندو اور مسلمانوں سب کا برابر حصہ رہا۔ اس زبان کو فارسی کے مقابلہ میں ہندی کا لقب ملا۔ کیونکہ اس کی پیدائش اسی ملک ہند میں ہوئی تھی۔ لفظ ہندی اردو کے لئے عرصہ دراز تک مستعمل رہا۔ آخر زمانے میں میر مصحفی نے تذکرہ شعرائے ہندی لکھا۔ اس میں صرف اردو شعراء کے تذکرے ہیں۔ جس سے

P.T.O

چھپی ہے۔ مگر اس کو کیا کہا جائے کہ ایسا کیوں ہے۔ یہ راز خدائی ہے۔ اس سے کون واقف ہے۔ اب عارف باللہ کہاں ہیں جو راز خدائی کو سمجھ سکیں۔ یہ تو وہی سمجھ سکتے ہیں جنہیں عرفان الٰہی ہو۔ دیکھئے اس سمندر کی تہہ سے کیا اچھلتا ہے۔ مسلمانوں کے حالات کیسے بدلتے ہیں۔ آفتاب نے تو غروب ہو کر بے شمار لعل بدخشاں بکھیر دیے ہیں۔

آج دہقانوں کی لڑکیوں کے گیت سادہ و پرسوز ہیں۔ عہد شباب کشتی دل کے لیے سیل رواں ہے۔ تند دھارا ہے جو انسان کے جذبات کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے۔

اے دریائے کبیر کے آبِ رواں تیرے قریب ہی یہ مسجد قرطبہ واقع ہے۔ تیرے کنارے کوئی بیٹھا ہوا حالات ماضی کے تصور میں کھویا ہے۔ وہ خواب دیکھ رہا ہے کہ پھر تیرے گنبدوں سے آواز اذان کی گونج فضاؤں میں سنائی دے رہی ہے، لیکن ابھی یہ اس کے مقدر میں حقیقتاً نہیں ہے۔

امت مرحومہ کی حیات اس کی بقا میں ہے جس کی زندگی میں جذبات انقلاب بیدار نہ ہوں وہ زندہ نہیں ہے۔ وہ مردہ ہے اور اس کی زندگی زندگی نہیں بلکہ موت ہے۔ وہ قوم جو ہر زمانہ میں ہر وقت اپنے اعمال کا احتساب کرتی ہے وہی قوم زندہ ہے۔ اگر خون جگر نہ ہو اگر دل میں فکر نہ ہو احساس اپنے اعمال کا احتساب کرتی ہے وہی قوم زندہ ہے۔ اگر خون جگر نہ ہو اگر دل میں فکر نہ ہو احساس نہ ہو تو زندگی کے سارے نقوش مٹ جاتے ہیں۔ اگر دل میں سوز و گداز نہ ہو تو کوئی نغمہ متاثر نہیں کر سکتا۔

اس طرح اقبال اس طویل نظم میں اپنے احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے قوم مسلم کو متنبہ کرتے ہیں کہ حیات جاودانی پانے کے لیے دل میں جذبہ فکر، جذبہ عشق، جہد مسلسل یعنی مسلسل اور یقین کامل چاہیے۔ جذبہ ایثار چاہیے۔ اور یہ سمجھنا چاہیے کہ شاہی امیری میں نہیں ہے بلکہ شاہی فقیری میں ہے۔ یہی وہ سیاست امت مرحومہ تھی جس نے دنیا کے بڑے سے بڑے شہنشاہوں کو نیست و نابود کر دیا اور بڑی سے بڑی سلطنتوں کو تہس نہس کر دیا۔

اقبال کی نظم "مسجد قرطبہ" ہمارے سوئے ہوئے جذبات کو بیدار کرتی ہے اور ہمارے برسوں سے دبے ہوئے ولولوں کو ابھارتی ہے۔ عمل پیہم، یقین محکم اور عشق جاوداں کا سبق ہمیں دیتی ہے اور ہمارے اسلاف کی شان و شوکت، رعب و دبدبہ، جہانبانی اور جہانداری سے روشناس کراتی ہے۔